کا اہتمام ہے۔

ہدایتِ عقل

فطرت کی ربوبیت کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان کو، جو ارتقا کے کمال کا مظہر ہے وجدانی و وہبی طور پر ہدایتِ عقل دی جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کا برگ و ساز خیر و خوبی کے ساتھ فراہم کر سکے لیکن انسان کو تسخیرِ کائنات کی جو قدرت عطا ہوئی ہے اور جو وسیع بلکہ ایک اعتبار سے لامحدود اختیارات اسے تفویض ہوئے ہیں۔ ان کے صحیح استعمال اور فکر و نظر کے فساد اور جذبات کے بے خیر معقول ہیجان سے بچنے کے لیے اسے ایک اور قسم کی ہدایت بھی دی گئی ہے۔ جو ہدایت وحی سے موسوم ہے۔ یہ ہدایت وحی مبدأ فیاض کا ایک خاص انعام ہے جس کی صلاحیت صرف انبیاء و مرسلین کے ضمیرِ منیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ کائنات کے باطنی نظام میں ہدایتِ عقل اور ہدایتِ وحی دونوں بروئے کار آتی ہیں اور ان دونوں کے مناسب امتزاج اور اعتدال سے ایک متمدن و مہذب معاشرہ کا ظہور ہوتا ہے جو انسانیت کبریٰ کے مادی، جسمانی، اخلاقی اور روحانی مقتضیات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تعاون

تعامل و تعاون فطرت کا ایک ہمہ رس قانون جس کی گیرائی سے کائنات کا کوئی گوشہ اور موجودات کا کوئی ذرہ خالی نہیں۔ کہیں یہ جذب و کشش باہم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس سے نظام شمسی قائم ہے۔ کہیں خود ذرہ کی ترکیب میں ربطِ باہم کا قانون باعث اتصال ہے غرضیکہ عالم کی ترکیب و تدوین اور ترتیب و تالیف میں تعاون کی ہمہ گیر حیثیت کارفرما ہے اور اسی باہمی ارتباط سے عالم کا نظام اور تسلسل قائم ہے۔

اگر ہر موجود اپنی ذات تک محدود رہتا اور دوسرے موجودات سے اس کا ربط و تعلق نہ ہوتا تو عالم میں نظم و ضبط کے بجائے افراتفری ہوتی۔ جس طرح عالمِ ظاہر یا عالمِ شہادت میں روابط کارفرما ہیں، عالمِ غیب یا عالمِ باطن میں روابط کا عمل دخل ہے۔ یہ الفاظ دیگر

تعاون کی حقیقت عالم شہادت اور عالم غیب دونوں کے حقایق پر حاوی ہے۔

فطرت کے نظام کا ہر جزو اور ہر گوشہ، ہر انداز اور ہر عنوان تعامل و تعاون کا ایک بلیغ اشارہ کر رہا ہے جسے سمجھنے کے لیے دیدۂ بصیرت چاہیے۔

اگر اجزائے آفرینش میں باہمی امداد کا قانون کام نہ کرتا ہوتا تو عالم کی موجودہ مربوط و مسلسل صورت کا قیام محال ہو جاتا۔ لیکن انسان نے فطرت کے اس قانون سے سبق اندوز ہونے کے بجائے تصادم و پیکار کے اپنے جذبات پیدا کر لیے ہیں اور انہیں مقبول عام بنانے کے لیے حب الوطنی اور قومیت کی دل آویز و دل نشین اصطلاحات سے کام لیا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ حق و انصاف اور امن عالم بحال کرنے کے نام پر جنگیں لڑی جاتی ہیں۔

چنانچہ بہ ظاہر دو عالمی جنگیں جارحیت ختم کرنے کے لیے لڑی گئیں مگر حقیقت میں یہ جنگ و جدال ایک مختصر و محدود مگر طاقتور طبقہ کے مخصوص مفادات کے تحفظ بے جا، تجارتی مفادات اور یا ہوس زر و زمین کے لیے تھا نہ کہ عامۃ الناس کے فائدہ کے لیے۔

اسی طرح صدیوں سے انسان فطرت کی تعلیم کے خلاف ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ قومیں آپس میں لڑتی ہیں اور اب تو ایٹمی جنگ کا خطرہ بھی لاحق ہے جو نوع انسانی کی مکمل تباہی و بربادی کا موجب ہو سکتا ہے اور عامۃ الناس کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مذہب، اخلاق اور انسانیت کا ناگزیر تقاضہ یہی ہے کہ جنگ لڑی جائے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

جرمن حکماء نٹشے فکٹے اور وان برن ہارڈی نے اس انسان کشی کو اپنے فلسفہ میں قومی حمیت و برتری اور ماسوں انسانیت کے ایسے فریب پرور اور دلکش پیرائے دیے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ردِّ عمل

فطرت کے ظاہری نظام میں ہر عمل کا ردِّ عمل ہے۔ یہ ہی باطنی نظام میں مکافاتِ عمل یا جزا سے موسوم ہے۔ اسی کے بارے میں سعدیؒ فرما گئے ہیں ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

نیک اعمال کی جزا نیک ہے اور بد اعمال کی جزا بد ہے۔ بادی النظر میں یہ بات محسوس و مشاہد نہ ہو۔ بالخصوص جارحیت کا ردِ عمل جارحیت کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ افراد کی جارحیت کے اثرات ممکن ہیں کہ ان کی زندگی یا چند پشتوں تک محدود رہیں۔ لیکن اقوام کی جارحیت کا ردِ عمل مسلسل رہتا ہے۔ اور صدیوں تک ختم نہیں ہوتا۔ اس لیے قوموں کو مکافاتِ عمل سے زیادہ ڈرتے رہنے کی ضرورت ہے

اسلام نے اسی بنا پر جارحیت کو لوجہ اللہ و فی سبیل اللہ محدود و مقید کر دیا ہے تاکہ امتِ مسلمہ جارحیت کے عواقب و نتائج سے محفوظ و مصون رہے اور جارحیت کے ردِ عمل کے اس تسلسل میں مبتلا نہ ہو جو قوموں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار اسی ضمن میں کسی صاحبِ نظر کا یہ قول ہے ؎

طبعے ہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گذشت

جہاد کا فلسفہ اپنی جگہ پر محکم ہے بلکہ شرطِ حیات ہے مگر جہاد حقیقت میں جہاد ہونا چاہیے، یعنی امرِ الٰہی اور حکمِ شریعت کے تابع ورنہ اس کی حیثیت ہوس زر و زمین سے زیادہ نہیں۔؟

جناب کوثر نیازی صاحب

قرآنِ حکیم اور امنِ عالم

قرآنِ حکیم کے نزدیک امن کی اہمیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت ایمان کو قرار دیتا ہے جو عربی زبان میں افعال کے وزن پر مصدر ہے اور خود امن سے ماخوذ ہے۔ اس کے نزدیک حیاتِ ایمانی کا ایک لازمی فائدہ اور نتیجہ یہ ہے کہ اس سے خوف کے بجائے امن نصیب ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا:

ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً — اور اللہ تعالیٰ ان کو ڈر کے بدلے میں امن عطا فرمائے گا۔

اس آیتِ پاک کی تشریح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جس میں آپ نے اسلامی معاشرے کی برکات بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"(امن و امان کے قیام میں) اللہ تعالیٰ تمہاری ایسی مدد کرے گا کہ ایک پردہ نشین عورت مدینہ سے حیرہ تک یا اس سے بھی طویل سفر تن تنہا کرے گی اور اس کو چوروں یا ڈاکوؤں کا کوئی خطرہ نہ ہوگا۔" (المسند احمد)

امن کو ایمان کا منطقی اور فطری مفہوم اور نتیجہ قرار دینے کے علاوہ قرآنِ حکیم نے اسے جداگانہ عنوان کے تحت بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت قرار دیا ہے۔ سورۂ "ایلاف" میں اہلِ ایمان کو بالعموم اور اہلِ عرب کو بالخصوص اسی نعمت کا احساس دلایا گیا ہے، فرمایا:

فلیعبدوا رب ھذا البیت	تو ان کیلئے بھی لازم ہے کہ بندگی کریں اس۔
الذی اطعمھم من جوع و	گھر کے رب کی جس نے ان کو کھانا دیا بھوک
آمنھم من خوف	میں اور امن عطا کیا حالتِ خوف میں۔

تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت امن کی جو قدر و منزلت مسلم سوسائٹی نے کی اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اس کی مثال نہیں ملتی اور انسانی جان اور عقیدے کا جو احترام اسلامی حکومتوں نے روا رکھا، زمانہ اب تک اس کی عملی نظیر دیکھنے کے لیے ترس رہا ہے۔

بدقسمتی سے معاندینِ اسلام نے اس بات کو بڑی شہرت دی کہ اسلام امن کا نہیں جنگ کا مذہب ہے اور اس سلسلے میں وہ جہاد کے لفظ کو بطور خاص غلط استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ جہاد دفع فساد ہی کا دوسرا نام ہے اور قیام امن ہی اس کا منزل اور نصب العین ہے۔

سب جانتے ہیں کہ جہاد کی اجازت عہد رسالت میں ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ملی ہے۔ لیکن قرآن حکیم کو دیکھیں تو مکی سورتوں میں بھی کوئی چھ مقامات پر اس کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے، جیسے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم	جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم
سبلنا	انھیں ضرور اپنے رستوں کی ہدایت کرتے
	ہیں

یا جیسے:

ومن جاھد فانما یجاھد	جو شخص جہاد کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے جہاد
لنفسہ	کرتا ہے۔

اگر جہاد محض قتال کا نام ہوتا تو ظاہر ہے کہ مکی دور میں تو اس کی گنجائش ہی نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ اس کا مفہوم یہ کچھ نہیں، خاصا وسیع ہے۔ چنانچہ جب ہم لغت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہماری اس رائے کی کامل تصدیق ہوتی ہے۔

لغت کی رو سے جہاد کا لفظ "جَہد" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "مشقت برداشت کرنا"۔ اس لیے جہاد کا مطلب ہوا "کسی مقصد کے لیے سختی جھیلنا، پوری پوری کوشش کرنا"۔

تاج العروس میں ہے:۔

وحقیقۃ الجهاد کما قال الراغب المبالغۃ واستفراغ الوسع والجهد فیما لا یرتضی وهو ثلثۃ اضرب مجاهدۃ العدو الظاهر والشیطان والنفس

(اور جیسا کہ امام راغب نے کہا ہے جہاد کی حقیقت ہے کسی قسم کی کمی اٹھا نہ رکھنا اور اپنی انتہائی وسعت تک کوشش کرنا اور اپنے آپ پر مشقت برداشت کرنا اور اس کی تین قسمیں ہیں۔ دشمن کا مقابلہ، شیطان کا مقابلہ اور اپنے نفس کی غلط خواہشات و ترغیبات کا مقابلہ)

اسلام کی پوری تاریخ اس امر کی شاہد عادل ہے کہ اس کے ماننے والوں نے شیطان اور نفس امارہ کے مقابلہ میں جہاد تو زندگی کے ہر لمحہ میں کیا ہے لیکن تلوار انہیں قرآن حکیم نے اس وقت اٹھانے کی اجازت دی ہے جب خود قیام و بقائے اسی ہی کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا۔

سورۃ الحج ملاحظہ ہو۔ جہاد کی اجازت دیتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ:۔

اذن للذین یقاتلون بانهم	یعنی اجازت دی گئی ان لوگوں کو لڑنے کی جن
ظلموا و ان الله علی نصرهم	پر ظلم کیا گیا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے
لقدیر ن الذین اخرجوا من	گئے محض اتنی سی بات پر کہ وہ کہتے تھے اللہ
دیارهم بغیر حق الا ان یقولوا	ہمارا رب ہے۔
ربنا الله	

اسی طرح سورۃ النساء میں وضاحت کر دی کہ جہاد کی یہ اجازت ہوس ملک گیری کی تسکین کے لیے نہیں محض مظلوموں کی حمایت اور ازالہ ظلم و فساد کے لیے ہے، فرمایا:

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل الله	اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ
والمستضعفین من الرجال و	میں اور کمزوروں کی خاطر جہاد نہ کرو جن میں کچھ
النساء والولدان الذین یقولون	مرد ہیں، کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو
ربنا اخرجنا من هذه القریۃ	دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار!
الظالم اهلها	ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے

والے سخت ظالم ہیں۔

اور سورۃ البقرہ میں فرمایا:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین	اور تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو
یقاتلونکم ولا تعتدوا ط ان	جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بلاشبہ
اللہ لا یحب المعتدین	اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

قرآنِ حکیم کے ان ارشادات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ جنگ کو پسند نہیں کرتا صرف بامرِ مجبوری اس کی اجازت دیتا ہے اور امن و امان اسے اتنا عزیز ہے کہ جہاں ظالم فریقِ مخالف ظلم و تعدی سے باز آنے کے لیے آمادہ ہوا اور اس نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ وہیں اس نے حکم دے دیا کہ بس جنگ روک دو۔

سورۃ انفال میں ہے:۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا	اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو تو بھی جھک جا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم و	اگر وہ تم سے علیحدگی اختیار کر لیں اور نہ
القوا الیکم السلم فما جعل اللہ	لڑیں اور صلح کی پیش کش کریں تو ایسے میں اللہ
لکم علیھم سبیلا (النساء)	تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ لڑنے کی
	اجازت نہیں۔

عہدِ رسالت کی تاریخ کا دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسلام معرکہ ہائے جہاد کے ذریعے سے اپنا دفاع بھی کرتا رہا ہے اور اس نے ظلم کی سرکوبی بھی کی لیکن اسلام کے پھیلنے پھیلانے میں جو غیر معمولی اہمیت صلح حدیبیہ کو حاصل ہے وہ خود غزوات کو بھی حاصل نہیں۔ یہ معاہدہ وہ تھا جس کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے ساتھیوں اور قریشِ مکہ میں صلح ہوئی تھی اور طرفین نے یہ تسلیم کیا تھا کہ عرب کا جو قبیلہ چاہے قریشِ مکہ کا حلیف بن جائے اور جس قبیلے کی مرضی ہو وہ مسلمانوں کا حلیف آ جائے۔

یہ یقیناً ایک سنہری موقعہ تھا۔ اس کے ذریعے پہلی بار سخت مخالفت کے دور اسلام کو جزیرۃ

عرب میں امن کی فضا نصیب ہوئی تھی پہلی دفعہ اس کا یہ حق تسلیم کیا جا رہا تھا کہ جو کوئی اسس کا پیغام سننا چاہے اس تک یہ پیغام پہنچایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے فروغ و ترقی میں امن کا یہ زمانہ سب سے بڑھ کر ممد و معاون ثابت ہوا اور اسلام بڑی سرعت کے ساتھ پورے جزیرۂ عرب میں پھیل گیا۔ اور یہ تنہا صلح حدیبیہ ہی کی بات نہیں، مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اسلام کی تبلیغ میں سیاسی رکاوٹیں نہیں تھیں اور جہاں پرامن حالات ملے، وہاں اسلام کو پھیلنے میں بڑی مدد ملی۔ سبب یہ ہے کہ اسلام دینِ حق ہے اور اس کی طرف بلانے کے دو ہی طریقے ہیں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ	اپنے رب کے رستہ کی طرف بلا یئے حکمت
والموعظۃ الحسنۃ	اور عمدہ نصیحت کے ساتھ

اور ظاہر ہے کہ حکمت اور عمدہ نصیحت کا راستہ سیرت و کردار کا راستہ تو ہو سکتا ہے، نیزے اور تلوار کا راستہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی اسلام کا کسی اور مذہب سے دلیل اور برہان کے ذریعہ ان میں مقابلہ اس کی اپیل زیادہ موثر ثابت ہوئی ہے اور وہ دوسرے تمام مذاہب پر غالب آیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مسلمان حکومتوں کو جنگیں بھی کرنی پڑیں اور مسلمان غیروں کے خلاف اور خود ایک دوسرے کے خلاف لڑتے بھی رہے اور کون نہیں جانتا کہ حکومتوں کے معاملے میں ایسا ہوتا آیا ہے لیکن جہاں تک دین اسلام کا تعلق ہے اسے آگے بڑھنے، پھیلنے اور فروغ پانے میں جس قدر ساز گار امن کی فضا ثابت ہوئی ہے جنگ و جدال نہیں ہوئی۔

مثال کے طور پر انڈونیشیا کے جزائر کو دیکھ لیجئے وہاں تاریخ کے کسی دور میں بھی کسی مسلمان حملہ آور نے پاؤں نہیں رکھے لیکن آج دس کروڑ انڈونیشیوں کی غالب اکثریت خدا کے فضل و کرم سے مسلمان نظر آتی ہے۔

اور یہ ہمارا ہی نتیجہ فکر نہیں تو بعض غیر مسلم اسکالروں نے بھی جب بے تعصبی سے اسلام اور

اشاعت اسلام کا جائزہ لیا ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھے ہیں کہ "اسلام شمشیر سے نہیں بلکہ اپنی تنویر سے پھیلا ہے"۔ مشہور انگریز عالم سر تھامس آرنلڈ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "دی پریچنگ آف اسلام" میں یورپ کے بعض تنگ نظر مصنفین کے اس اعتراض کی مفصل اور مدلل تردید کی ہے اور اس کے لیے تاریخ کی مستند اور ناقابل تردید شہادتیں پیش کی ہیں کہ "اسلام امن سے نہیں لڑائیوں سے پھیلا ہے"۔ اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے صفحہ ۴۲۷ کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر آرنلڈ لکھتے ہیں:۔

"Islam has learned the uses of adversity and so far from a decline in worldly prosperity being a presage of the decay of this faith it is significant that those very muslim countries that have been longest under christian rule show themselves most active in work of proselytising. The Indian and Malay mahammadans display a zeal and enthusiasm for the spread of the faith which one looks for in vain in Turkey or morocco."

"یعنی اسلام مصائب اور آزمائشوں کے فائدے جانتا ہے اس لیے دنیوی کامیابیوں میں زوال اس کے عقیدہ اور پیغام کا زوال نہیں۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ جو مسلمان ملک عرصۂ دراز تک عیسائی حکومتوں کے ماتحت رہے ہیں۔ انہی میں اسلام بہت زیادہ پھیلا ہے جو کچھ ترکی اور مراکش کی آزاد مسلم حکومتوں سے نہیں ہو سکا۔ اس جذبہ اور جوش و خروش کا اظہار اشاعت اسلام کے لیے ہندوستان اور ملایا کے مسلمانوں نے کیا ہے"۔

اور ایسا کیوں ہے کہ اسلام امن کے زمانہ میں زیادہ پھیلا اور ان ملکوں میں بھی اس کی سیر ان کی

پذیرائی ہوئی جن میں مسلمان محکوم اور غلام تھے تو اس کا سبب یہ ہے کہ پیغام قرآن اور امن و امان دونوں لازم و ملزوم ہیں اور یہ بات ہم نہیں کہتے ۱۹۱۱ء میں نامور فرانسیسی مستشرق موسیو گاسٹن نے فرانس کے مشہور اخبار "فگارو" میں ایک مفید اور علمی سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا "کیا اسلام دنیا سے معدوم ہو گیا تو امن و امان قائم رہ سکے گا؟" ان مضامین کا ترجمہ عربی زبان میں بیروت کے اخبار "البلاغ" نے شائع کیا۔ اس اخبار کے ۱۲ صفر ۱۳۳۰ھ کے شمارہ سے ان مضامین کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ مضمون نگار رقمطراز ہیں:۔

"یہ ایک کھلی ہوئی صاف اور واضح بات ہے کہ اسلام حقیقت میں ایک طرح کا اجتماعی مذہب (سوشل ریلیجن) ہے جس کو دنیا کی ۱/۶ آبادی دین حق تسلیم کرتی ہے اور گویا دنیا کی ہستی اس مذہب کی بقا اور ہستی پر منحصر ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اس عاقلانہ مذہب کے قانون (قرآن کریم) میں وہ تمام فوائد اور مصالح موجود ہیں جن سے زمانۂ حال کا تمدن بنا ہے اور جو گویا اسلام ہی کے امتزاج عناصر کا نتیجہ ہے۔

اس حیرت انگیز سائنٹیفک مذہب نے دنیا کی عمرانی ترقی کے لیے ہر قسم کے بنیادی وسائل و ذرائع یورپ کو بہم پہنچائیں۔ گو ہم میں کوئی شخص بھی اس کی فضیلت کا اعتراف نہ کرے اور اس کے احسان کا رہین منت نہ ہو مگر امر واقعہ یہی ہے۔"

قیام امن کی اصل بنیاد یہ ہے کہ لوگ انسانی جان کا کہاں تک احترام کرتے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن حکیم نے جو تعلیمات بخشی ہیں دنیا کی کوئی کتاب ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ قتل ناحق پر انسانی زندگی کے آغاز سے لے کر سائنس اور ترقی کے اس دور تک کہنے والوں نے بہت کچھ کہا ہے اور کوئی شک نہیں کہ بہت خوب کہا ہے۔ لیکن جو بات اس پر قرآن حکیم نے کہہ دی ہے، وہ اپنی بلاغت اور اثر انگیزی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ فرمایا:

من قتل نفساً بغیر نفس او فساد	جس شخص نے کسی کو قصاص یا زمین پر
فی الارض فکانما قتل الناس	فساد کرنے کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے

پذیرائی ہوئی جن میں مسلمان محکوم اور غلام تھے تو اس کا سبب یہ ہے کہ پیغام قرآن اور امن و امان دونوں لازم و ملزوم ہیں اور یہ بات ہم نہیں کہتے ۱۹۱۱ء میں نامور فرانسیسی مستشرق موسیو گاسٹن نے فرانس کے مشہور اخبار "فگارو" میں ایک مفید اور علمی سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا "کیا اسلام دنیا سے معدوم ہو گیا تو امن و امان قائم رہ سکے گا؟" ان مضامین کا ترجمہ عربی زبان میں بیروت کے اخبار "البلاغ" نے شائع کیا۔ اس اخبار کے ۱۲ صفر ۱۳۳۰ھ کے شمارہ سے ان مضامین کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ مضمون نگار رقمطراز ہیں:۔

"یہ ایک کھلی ہوئی صاف اور واضح بات ہے کہ اسلام حقیقت میں ایک طرح کا اجتماعی مذہب (سوشل ریلیجن) ہے جس کو دنیا کی ۱/۶ آبادی دین حق تسلیم کرتی ہے اور گویا دنیا کی ہستی اس مذہب کی بقا اور ہستی پر منحصر ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اس عاقلانہ مذہب کے قانون (قرآن کریم) میں وہ تمام فوائد اور مصالح موجود ہیں جن سے زمانۂ حال کا تمدن بنا ہے اور جو گویا اسلام ہی کے امتزاج عناصر کا نتیجہ ہے۔

اس حیرت انگیز سائنٹیفک مذہب نے دنیا کی عمرانی ترقی کے لیے ہر قسم کے بنیادی وسائل و ذرائع یورپ کو بہم پہنچائیں۔ گو ہم میں کوئی شخص بھی اس کی فضیلت کا اعتراف نہ کرے اور اس کے احسان کا رہین منت نہ ہو مگر امر واقعہ یہی ہے۔"

قیام امن کی اصل بنیاد یہ ہے کہ لوگ انسانی جان کا کہاں تک احترام کرتے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن حکیم نے جو تعلیمات بخشی ہیں دنیا کی کوئی کتاب ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ قتل ناحق پر انسانی زندگی کے آغاز سے لے کر سائنس اور ترقی کے اس دور تک کہنے والوں نے بہت کچھ کہا ہے اور کوئی شک نہیں کہ بہت خوب کہا ہے۔ لیکن جو بات اس پر قرآن حکیم نے کہہ دی ہے، وہ اپنی بلاغت اور اثر انگیزی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ فرمایا:

من قتل نفساً بغیر نفس او فساد	جس شخص نے کسی شخص کو قصاص یا زمین پر
فی الارض فکانما قتل الناس	فساد کرنے کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے

جمیعاً ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعًا — تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا اور جو کسی انسانی زندگی کی بقا کا سبب بنا تو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو زندہ کر دیا۔

مفسرین نے اس سلسلے میں بہت سے معارف بیان کیے ہیں کہ قرآن حکیم نے کیوں ایک جان کے اتلاف کو تمام نوعِ انسانی کا اتلاف قرار دیا ہے مگر سادہ اور دل نشیں بات اس سلسلے میں یہی ہے کہ قتلِ ناحق ایک ایسا جرم ہے جس کے بعد امن وامان کا جنازہ اٹھ جاتا ہے۔ قانون کے عطا کردہ تحفظات پر سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح ایک قتل کرنے والا حقیقت میں کتنے ہی انسانوں کے قتل کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔

اسلام میں انسانی جان کی حرمت پر جو زور دیا گیا ہے۔ اس پر عمل کرانے کا اہتمام یہ تھا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسلام کی بیعت لیتے تو اس میں جہاں اور کئی بنیادی باتوں کا اقرار کراتے وہاں ایمان لانے والے سے اس کا بھی عہد لیتے کہ وہ قتل نہیں کرے گا۔

بخاری شریف میں حضرت عبادہ کی روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں، ہم نے آپؐ سے اس بات پر بیعت کی کہ نہ تو ہم شرک کریں گے، نہ زنا کریں گے، نہ چوری کریں گے اور نہ اس شخص کو قتل کریں گے جس کا قتل اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور نہ لوٹ مار کریں گے

ایک طرف انسانی جان کی حرمت کے لیے یہ عملی اہتمام فرمایا۔ دوسری طرف بار بار مواخذۂ آخرت سے ڈرایا اور اس کا اعلان فرمایا کہ :۔

"انفرادی معاملات میں قیامت کے دن جہاں اولیں پرسش نماز کی ہوگی۔ وہاں اجتماعی معاملات میں سب سے پہلے قتل کے مقدمات پیش ہوں گے۔"

بخاری شریف میں ہے، آپ نے فرمایا:

اول ما یقضیٰ یوم القیامۃ فی الدماء — قیامت کے دن جس مسئلہ کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ قتل کا مسئلہ ہوگا۔

اس بات کو مسلسل اور متواتر ذہن نشین کرانے کی کوششوں کا یہ عالم تھا کہ اپنے آخری حج کے خطبے میں خاص طور پر آپ نے اس کی وضاحت فرمائی اور اس طرح ثابت کر دیا کہ اپنے رب

کے حضور جاتے ہوئے عمر کے آخری لمحوں میں بھی آپ کو یہی فکر دامنگیر تھی کہ کہیں انسانیت امن و سکون سے میرے بعد محروم نہ ہو جائے۔

حجۃ الوداع کا یہ خطبہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بلا شبہہ حقوق انسانی کا عالمی منشور ہے اور اس پہلے ہیومن چارٹر کے ان الفاظ پر عالمی امن کے سلسلے میں زمانہ آج تک کوئی اضافہ نہیں کر سکا کہ:

ایھا الناس ان دمائکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم ھذا وکحرمۃ شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا	اے افرادِ نسلِ انسانی! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں ہمیشہ کے لیے۔ ان چیزوں کی اہمیت اور عزت ایسی ہی ہے جیسی تمہارے اس حج کے دن کی اور اس ماہِ مبارک ذی الحجہ کی خاص کر اس شہر میں ہے

ہو سکتا ہے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ تعلیمات و ہدایات تو صرف اہلِ ایمان سے تعلق رکھتی ہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ یہ گمان صحیح نہیں اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کے حقوق کا بھی ویسا ہی تحفظ کرتی ہے جیسا اپنی مسلمان رعایا کا اس کے نزدیک جان، مال اور آبرو کی حفاظت کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں۔

اللہ اور رسول نے اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق کی ادائیگی کا ذمہ لے رکھا ہے اس لیے انہیں "ذمی" کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن سے خدا اور رسول نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ ان کی جان مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔ اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

من قتل معاھدا لم یرح رائحۃ الجنۃ	جو مسلمان کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کرے گا، جس سے معاہدہ ہے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا فیصلہ ہے کہ غیر مسلم ذمی کو قتل کرنے والا مسلمان قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ انسانی جان کی حرمت کے معاملہ میں اسلام مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق روا نہیں رکھتا۔

اسلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا اور اس